(غلام گردش)

بائیاں انگھوٹھا

کرسٹی براؤن (Chirsty Brown) پیدائشی طور پر معذور تھا۔ آئرلینڈ میں پیدا ہونے والا بچہ ہاتھ پیر ہلانے کی قدرتی طاقت سے محروم تھا۔ گوشت کا ایک لوتھڑا۔ کرسٹی کو ایک مہلک بیماری Cerebral Palsy تھی، جسکی وجہ سے چلنے پھرنے، اُٹھنے اور کسی قسم کے کام کرنے کی استطاعت نہ رکھتا تھا۔ پیدا ہوتے ہی ڈاکٹروں نے کہا کہ اسکی پرورش گھر میں کرنا ناممکن ہے۔ اسلیے کہ کرسٹی کو ہمہ وقت میڈیکل امداد کی ضرورت پڑے گی۔ والدین کیلئے یہ فیصلہ بہت مشکل تھا کہ اسے ڈاکٹروں کے مشورے کے حساب سے خصوصی ہسپتال میں داخل کروادیں یا پھر گھر لے جائیں۔ فطری بات تھی کہ گھر میں تمام سہولتیں میسر کرنا ممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ کرسٹی اوائل عمری ہی میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ براؤن کے والدین نے فیصلہ کیا کہ اپنے لختِ جگر کو گھر لے جائینگے۔

براؤن بدقسمتی سے کسی بھی سکول یا کالج نہیں جاسکا۔ اسے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ نہیں مل سکا۔ آئرلینڈ میں ایک صدی پہلے سوشل سیکیورٹی کا نظام ابتدائی طور پر آچکا تھا۔ اسکے برعکس نوے سے سو برس پہلے برصغیر میں لوگ کیسے زندگی گزار رہے تھے، اس پر بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بیسویں صدی کے شروع تک برصغیر میں اقتصادی، صنعتی، اور علمی ترقی نہ ہونے کے برابر تھی۔ چند تعلیم گاہیں جو موجود تھیں، وہ بنیادی طور پر انگریزوں کی مرہونِ منت تھیں۔ دیکھا جائے تو چند مصنوعی تبدیلیوں کے علاوہ، پورا برصغیر آج بھی ایک بے معنی سی زندگی گزار رہا ہے۔ جتنی بے بسی، اس خطے میں سانس لے رہی ہے، اسکا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ خیر کرسٹی براؤن اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا جو ہر طریقے سے ترقی کر رہا تھا۔ سٹی کونسل نے کرسٹی کے گھر ایک سوشل ورکر بھجوانی شروع کردی۔ کیترنیا ڈیل ہینٹ نام کی اس خاتون نے کرسٹی کو کتابیں لاکر دینا شروع کردیں۔ کیترینا، اس بات پر ششدر رہ گئی کہ اپاہج ہونے کے باوجود کرسٹی کو انگریزی ادب اور مصوری کا حد درجہ جنون تھا۔ سوچ و بچار کے بعد کیترینا نے فیصلہ کیا گیا کہ کرسٹی کو مصوری کا تمام سامان اور مختلف موضوعات پر کتابیں مہیا کرنی چاہییں۔ کتابوں کی حد تک تو درست تھا کہ اسکی بصارت معمول کے مطابق تھی۔ مگر مصوری کیسے ہوگی۔ اس سوال کا کسی کے پاس بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ خدا کا کرنا تھا کہ کرسٹی کی بائیں ٹانگ معمولی سی حرکت کرتی تھی۔ بائیں پاؤں کی صرف دو انگلیاں معمولی سی جاندار تھیں۔ کرسٹی نے اپنے بائیں پاؤں کے انگھوٹے کے ساتھ انگلی کو ملا کر قلم کو اس میں پھنسا دیا۔ اس نے وہ کام کیا، جسے عام لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔ پاؤں سے انتہائی خوبصورتی سے لکھنے کا عمل شروع کردیا۔ ساتھ ساتھ برش کو بھی پاؤں میں اڑیس کو مصوری شروع کردی۔ یہ صلاحیت حیرت انگیز تھی۔ تھوڑے عرصے میں کرسٹی نے حد درجہ محنت سے لکھنے اور پینٹ کرنے کی نایاب صلاحیت حاصل کرلی۔ یہ حیران کن بات تھی۔ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ایک معذور انسان اپنے پیر کے انگھوٹھے سے اتنا بہترین کام کرسکتا ہے۔ اسکے ڈاکٹر کو جب یہ کچھ پتہ چلا تو کرسٹی کے پاس آیا اور حد درجہ حوصلہ افزائی کی۔ ڈاکٹر رابرٹ کولس بذاتِ خود بھی ایک ادیب تھا۔ پیہم حوصلہ افزائی سے کرسٹی نے اپنا پہلا ناول مکمل کیا۔ ناول کا نام My left Foot (میرا بائیاں پاؤں) تھا۔ ناول میں کرسٹی نے اپنی تمام محرومیوں اور اپنے شہر ڈبلن کی بھرپور زندگی کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر کولس نے اپنے ذرائع استعمال کرکے کرسٹی کے ناول کو چھپوا دیا۔ جیسے ہی

ناول چھپ کر مارکیٹ میں آیا،تو صرف ایک دن میں اسکی ساری کاپیاں فروخت ہوگئیں۔کرسٹی پوری دنیا میں مشہور ہوگیا۔خط وکتابت کا دور تھا۔کرسٹی کو پوری دنیا سے اَن گنت خط موصول ہونے شروع ہوگئے۔آئرلینڈ سے ہوتا ہوا یہ ناول،ان تمام ممالک میں پہنچ گیا جہاں انگریزی پڑھی اور بولی جاتی ہے۔چند برس کے بعد،کرسٹی نے اپنا دوسرا شہرہ آفاق ناول لکھا۔اسکا عنوان تھا "Down all the Days"اس نے تو قیامت برپا کردی۔چودہ زبانوں میں ترجمہ ہونے کے بعد ہالی وڈ میں اس ناول پر ایک فلم بنائی گئی۔فلم کو پانچ اکیڈمی ایوارڈ ملے۔دراصل دوسری کتاب،پہلے ناول ہی کا ایک تسلسل تھا۔کرسٹی نے اسکے ساتھ ساتھ شعری مجموعے اور دیگر ناول بھی لکھے جو حیرت انگیز حد تک مقبول ہوئیں۔ساتھ ساتھ اسکی مصوری بھی حد درجہ پختہ اور خوبصورت ہوگئی۔کرسٹی اب ایک بین الاقوامی سطح کا لکھاری اور مصور بن چکا تھا۔دنیا کے کونے کونے میں اسکی شہرت تھی۔انچاس برس کی عمر میں کرسٹی وہ معیاری کام کرگیا،جسکے لیے اَن گنت زندگیاں چاہییں۔چھوٹی سی عمر میں اس نے حد درجہ بیمار ہونے کے باوجود ذہن اور روح کو زندہ رکھا۔بائیں انگھوٹھے نے صلاحیت کا وہ جادو جگایا جو آج تک ایک دیومالائی حیثیت رکھتا ہے۔

مقصد قطعاً یہ نہیں کہ آپکو کرسٹی براؤن کے ادبی اور فکری کارناموں سے آگاہ کروں۔یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ اسکے شہرہ آفاق ناول پڑھنے شروع کردیں۔مقصد بہت سادہ سا ہے۔اگر کرسٹی معذور ہوکر لافانی کام کرسکتا ہے تو ہم مکمل جسم اور بھرپور دماغ رکھنے کے باوجود حد درجہ کامیاب کیوں نہیں ہوسکتے۔سوال یہ ہے کہ کیا ہم اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو بھرپور طریقے سے استعمال کرتے ہیں یا نہیں۔اردگرد دیکھیے۔ننانوے فیصد لوگ آپکو کسی نہ کسی طور پر شکوہ وشکایت کرتے نظر آئینگے۔انکی نظر میں حالات انہیں ترقی سے روک رہے ہیں۔حالات،سماج اور مشکلات کا ذکر کرتے کرتے پوری زندگی بے مقصد سی گزار دیتے ہیں۔لوگوں سے گفتگو کیجئے۔پوچھیے کہ تمہیں روزگار کیوں نہیں مل رہا۔متعدد توجیہات پیش کرینگے۔کوئی سرمایہ نہ ہونے کا جواز بنائیگا۔کوئی کہے گا کہ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔دکان کھولی مگر چل نہ پائی۔نوکری ڈھونڈی تو وہ سفارش کے بغیر ممکن نہیں تھی۔درست ہے کہ ہمارے نظام میں آگے بڑھنا قدرے مشکل ہے۔مگر کیا جس نوجوان کو نوکری نہیں ملی،اس نے گھر آکر تجزیہ کیا کہ اسکے اندر کونسی ایسی کمی یا خامی تھی جسکی بدولت ناکام ہوگیا۔کیا اس نے تمام سوالات کا جواب بہترین طریقے سے دیا۔ذاتی تنقید کا رویہ نہ ہونے کے برابر نظر آئیگا۔ہر کوئی سفارش اور وسائل کی بات شروع کریگا اور اسی پر تان توڑ دیگا۔انٹرویو کرنے والوں کے متعصب ہونے کا ذکر کریگا۔مگر اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا ذکر بالکل نہیں کریگا۔یہی کہے گا اسکے ساتھ حد درجہ زیادتی اور ظلم ہوا ہے۔یہ ایک عمومی رویہ ہے۔سی ایس ایس کے امتحان کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔1984 میں جب سی ایس ایس کا امتحان دیا تو یہ جان کر ذہنی جھٹکا لگا کہ تقریباً ستر سے اَسی فیصد لوگ بغیر کسی تیاری کے امتحان گاہ میں صرف اور صرف تجربہ حاصل کرنے کیلئے آئے ہیں۔بہت سے اُمیدواروں سے بات چیت ہوئی۔اکثریت یہ کہتی تھی کہ وہ تو صرف دیکھنا چاہ رہے تھے کہ پرچے کس طرح دیے جائیں۔صرف اور صرف تجربہ حاصل کرنے کیلئے اس بار امتحان دیا ہے۔سی ایس ایس میں کیونکہ تین چانس ہوتے ہیں،لہذا بقول انکے،اگلی دفعہ پوری تیاری کرکے آئینگے۔مگر اگلی باری کبھی نہیں آتی۔نوے فیصد اُمیدواروں کو ادراک ہی نہیں ہوتا کہ انکا سال ضائع ہورہا ہے۔اگلے برس انہیں مختلف نوعیت کی مشکلات سے گزرنا پڑیگا۔وہ کبھی بھی

اپنی غلطی یا کوتاہی تسلیم نہیں کرتے۔

سی ایس ایس کے امتحان کو چھوڑ دیجئے۔ کسی بھی میدان کا سنجیدہ تجزیہ کیجئے۔ چلیے، کرکٹ کو لے لیجئے۔ درجنوں ایسے کرکٹر دیکھے ہیں جو سلیکٹرز کے تعصّبانہ رویہ کی شکایت کرتے نظر آئینگے۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں کچھ سچائی بھی ہو۔ مگر انکو جسمانی ٹریننگ اور کرکٹ کی سخت کوش تربیت کے متعلق پوچھ لیجئے۔ اکثریت بین الاقوامی سطح تو دور کی بات، ملکی لیول پر بھی کامیاب کھلاڑیوں جتنی محنت کرتے نظر نہیں آئینگے۔ دراصل اکثریت بغیر محنت کیے سب کچھ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ہاں، ایک اور بات۔ ہم میں سے واضح اکثریت اپنی استطاعت بڑھانے کو جرم سمجھتی ہے۔ اگر کسی کی انگریزی کمزور ہے، تو پہلا رویہ تو انگریزی زبان سے روگردانی ہوگی۔ مجال ہے کہ انگریزی کتاب کو ہاتھ لگایا جائے۔ صرف یہ کہہ دینا، کہ فلاں مضمون مشکل لگتا ہے یا سمجھ نہیں آتا، یا اس سے مجھے رغبت نہیں ہے۔ اپنی استطاعت کو نہ بڑھانے کا ایک کمزور ترین رویہ ہے۔ تعلیم کو رہنے دیجئے۔ اگر کسی نے چھوٹا سا سٹور کھول رکھا ہے۔ اس پر دن رات ڈیوٹی نہیں دیتا۔ ملازمین پر کڑی نظر نہیں رکھتا۔ چیزوں کے معیار کو ہر ممکن اعلیٰ سطح پر نہیں رکھتا۔ پھر انہی وجوہات کی بنیاد پر ناکام ہوجاتا ہے۔ کاروبار ختم ہوجاتا ہے۔ تو وہ شخص کبھی بھی اپنی کمزوریوں کا ذکر نہیں کریگا۔ اپنی استطاعت کو نہ بڑھانے کے المیہ پر خاموش رہیگا۔ کوتاہیوں کو چھپاتے چھپاتے ناکامی کی دلدل میں ڈوب جائیگا۔ مگر فکر اور ذاتی تدبر کرنے کی کوئی خواہش نہیں رکھے گا۔

انفرادی سطح سے نکل کر قومی سطح پر آیئے۔ آپکو ہر لیڈر، قائد، رہنما شکایت کرتا نظر آئیگا۔ کوئی بتائیگا کہ معیشت تباہ ہوگئی۔ حکومتی پالیسی بالکل نامعقول اور غلط ہے۔ حکومت تو کاروبار ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ بیرونی قرضے لے لیکر قوم کو غلام بنا دیا گیا ہے۔ مگر کوئی بیانگ دہل اقرار نہیں کریگا کہ یہاں کوئی تاجر، کوئی سرمایہ دار، کوئی امیر آدمی، حکومت کو ٹیکس نہیں دیتا۔ ننانوے فیصد صنعتی طبقہ اور تاجر، ٹیکس چوری کے اندر ملوث ہیں۔ اس رویہ کو معقول بنا دیا گیا ہے۔ جہاں کوئی ٹیکس وصول کرنے کی کوشش کرے تو اعلان کر دیا جاتا ہے کہ معیشت کا پہیہ روکنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ آپ لاہور میں کسی بھی چیز کی خریداری کیلئے نکلیں۔ فوراً احساس ہوجائیگا کہ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا دکاندار بھی ٹیکس والی رسید دینے کو گناہ سمجھتا ہے۔ اگر ہوٹل میں پکا بل مانگ لیں تو کھلبلی مچ جاتی ہے۔ مینیجر تک آپ کے پاس آجاتا ہے۔ بل میں ٹیکس کے بغیر فروخت شدہ اشیاء کا اندراج کرنے پر اصرار کریگا۔ اَن گنت جگہ تو بل دینے کا رواج ہی نہیں ہے۔ صرف پیسے بتا دیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی بھی حکومت ٹیکس لینے پر اصرار کرے تو قیامت برپا کر دی جاتی ہے۔ حقیقت حد درجہ تلخ ہے۔ یہی حال کارخانوں اور ملوں کا ہے۔ پورے ملک میں ہر شعبے میں ایک جیسا حال ہے۔ برا نہ منایئے گا۔ ہم مجموعی طور پر ایک نااہل اور جیب کترے طرز کی قوم بن چکے ہیں۔ اکثریت کی بات کر رہا ہوں۔ ایک اقلیت صائب طریقے سے زندگی گزارنے کی کوشش کر رہی ہے جو اب حد درجہ مشکل ہوتا جارہا ہے۔

ہم میں ہر ایک انفرادی اور قومی سطح پر اپنی بھرپور استطاعت کو استعمال کیے بغیر ترقی کرنا چاہتا ہے۔ کامیاب ہونا چاہتا ہے۔ ہم کمزوریوں کو دور کیے بغیر اپنی ناکامیوں کو بیرونی عوامل میں تلاش کرتے ہیں۔ یقین ہے کہ ہم بالکل ٹھیک ہیں، باقی سب غلط ہیں۔ تمام لوگ اور قومیں ہمیں ناکام بنا رہی ہیں۔ ہمارے خلاف سازشیں در سازشیں ہو رہی ہیں۔ ہمارے ہاں، کوئی شخص یا ادارہ کرسٹی براؤن کی

طرح شدید محنت کو عبادت نہیں اپناتا۔ اپنی بھرپور استطاعت اور خوبیوں کو استعمال نہیں کرتا۔ اپنی ناکامیوں سے سبق نہیں سیکھتا۔ پھر الزام سارے کا سارا دوسروں پر ڈال دیتا ہے۔ پیہم ناکام رہنے کا یہ سفر، انفرادی اور قومی سطح پر ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ شائد ہم کامیاب ہونا ہی نہیں چاہتے۔ کوئی بھی کرسٹی کی طرح اپنا بائیاں انگھوٹھا استعمال ہی نہیں کرنا چاہتا۔

راؤ منظر حیات